ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری

مولانا عبیداللہ سندھی کا دارالعلوم دیوبند سے اخراج

پس منظر کے واقعات پر ایک نظر

(تیسری قسط)

مولانا سندھی کا احتساب کرنے اور انھیں گرفت میں لانے کے لیے ایک "محکمۂ احتساب" قائم کیا گیا تھا لیکن یہ محکمہ دارالعلوم کے نظام کا کوئی حصہ نہ تھا، بلکہ مولانا شبیر احمد عثمانی نے قائم کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس میں شمس العلما مولانا محمد احمد مہتمم دارالعلوم کا ایما ضرور شامل ہوگا۔ نائب مہتمم تو مولانا شبیر احمد عثمانی کے بڑے بھائی تھے ان کی اجازت ومشورہ سے یہ محکمہ قائم کیا گیا ہوگا۔ اور ان کے ایک بھائی دارالعلوم کے سب سے بڑے مفتی تھے، محکمۂ احتساب کے قیام میں ان کے مشورے کو کیسے نظرانداز کر دیا گیا ہوگا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں:

> "دارالعلوم دیوبند میں ہمارے نہایت ممتاز اور نامور علماء جیسے علامہ انور شاہ کشمیری اور شیخ الاسلام شبیر احمد عثمانی نے اپنا ایک احتسابی محکمہ قائم کیا اور اس کے سامنے مولانا سندھی بہ حیثیت ایک ملزم کے پیش کیے گئے"

دارالشوریٰ میں جلسہ ہوا۔ تقریر یا احتساب کرنے والوں میں مولانا انور شاہ کاشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی (دیوبندی) اور مولانا غلام رسول خان (ہزاروی) استاد فلسفہ ومنطق دارالعلوم تھے۔ حکم کی حیثیت سے اربابِ اہتمام اور مفتی دارالعلوم، سامعین میں اساتذۂ کرام اور تماشائیوں کی حیثیت میں دارالعلوم کے طلبہ موجود تھے۔ مسئلہ مختلف فیہا غیر مسلموں میں تبلیغ تھا، مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں:

"مولانا عبیداللہ نے کھڑے ہوکر ... یہ فرمایا کہ قرآن پاک کی یہ آیت شریفہ "لانذرکم به ومن بلغ" (تاکہ ڈراؤں میں تم کو جس تک بات پہنچی) سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بنی آدم میں جن لوگوں تک قرآن کا پیغام نہیں پہنچا، ان سے اسلام کے قبول نہ کرنے کا مواخذہ نہ ہوگا"

تبلیغ کے باب میں مولانا گیلانی نے مولانا سندھی مرحوم کا ایک اور جملہ بھی نقل کیا ہے مولانا سندھی نے فرمایا:

"آج کل کے یورپین غیر مسلم لوگوں میں تبلیغ حق پوری نہیں ہوئی اس لیے اگر ان کے اخلاق اچھے ہیں تو وہ نجات کے مستحق ہیں"۔

مولانا سندھی مرحوم کے ان خیالات پر جو ردعمل ہوا حضرت مولانا گیلانی نے اسے بھی بیان فرمایا ہے ہم یہاں تینوں بزرگوں کے ردعمل کو الگ الگ بیان کرتے ہیں:

۱. مولانا شبیر احمد عثمانی (دیوبندی)

"مولانا شبیر احمد عثمانی یہ سُن کر غصے میں آگئے، انھوں نے اس خیال پر تنقید فرمائی۔ ان کی تقریر تو یاد نہیں رہی"۔

۲. مولانا غلام رسول خاں (ہزاروی)

"ان (مولانا شبیر احمد عثمانی) کے بعد مولوی غلام رسول صاحب مرحوم نے تقریر فرمائی، جس سے ان کا یہ فقرہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی اگرچہ ہماری جماعت کے ایک فرد ہیں لیکن (جس طرح جب کوئی عضو سڑ جاتا ہے تو (اُسے) کاٹ دیا جاتا ہے، اسی طرح یہ بھی اسی جماعت سے الگ کر دیے گئے ہیں"۔

۳. علامہ انور شاہ کاشمیریؒ کے ردعمل کے بارے میں مولانا گیلانی مرحوم لکھتے ہیں:

"مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کا یہ کلام سُن کر بہت رنجیدہ خاطر ہوئے اور آگ بگولہ ہوکر یہ کہتے ہوئے ٹوٹ پڑے کہ آسمان اور زمین پر تبلیغ ہو چکی ہے۔ وہ کافر سب جہنمی ہیں۔ اگر تیرا یہی عقیدہ ہے تو تیرا مقام بھی جہنم ہے"۔

اسی سلسلۂ بیان میں مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

"مدرسہ کے مہتمم اور نائب مہتمم کو بھڑکایا کہ عبیداللہ کا عقیدہ فاسد اور کافرانہ ہے کہتا ہے

کہ موجودہ کفار نجات کے مستحق ہیں اور عام مولوی اور طلبہ کا ایک جلسہ بلا کر مولانا سندھی کو بھی بلایا اور کہا کہ تم نے کفر کا کلمہ کہا ہے۔ اب توبہ کر کے ایمان کی تجدید کرو، مولانا سندھی نے دیکھا کہ جماعت برافروختہ ہے تو آپ نے فرمایا کہ اگر یوں ہی ہے، تو میں اٰمنت باللہ پڑھ دیتا ہوں اور ساتھ ہی کلمہ شہادت بھی پڑھ کر سنایا۔"

فکرِ احتساب کی جو کارروائی ہمارے سامنے ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ احتساب کے لیے ایسا دن مقرر کیا تھا کہ حضرت شیخ الہند دیوبند میں موجود نہ ہوں۔ اب اس کارروائی پر ایک نظر ڈالیے تو فوراً محسوس ہو جاتا ہے کہ:

۱۔ یہ جلسہ احتساب نہ تھا بلکہ "جلسہ اعلانِ فیصلہ" تھا۔ فیصلہ پہلے ہی کر لیا گیا تھا۔ اب دارالعلوم میں مولانا سندھی کے خلاف عام فضا پیدا کرنے کے لیے یہ ڈراما کھیلا گیا تھا۔

۲۔ مولانا سندھی مرحوم نے توبہ کی، ایمان کی تجدید کی اور کلمۂ شہادت پڑھا لیکن فیصلہ پھر بھی ان کے خلاف کر دیا گیا۔ اور خواہ زبان سے نہ کہا ہو لیکن عمل سے یہی ثابت کیا کہ ان کا تجدیدِ ایمان لو "اقرار باللسان" محض دباؤ کے تحت ہے۔ اسے "اقرار بالقلب" قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مولانا سندھی کو کافر قرار دے دیا گیا منصفین نے فیصلے پر صاد کیا اور دارالافتاء کی مہر سے اسے معتوب و موثق کر دیا گیا۔

۳۔ اور جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے کہ احتساب کے لیے ایسا دن مقرر کیا گیا کہ حضرت شیخ الہند دیوبند میں موجود نہ ہوں، چنانچہ یوں ہی ایک روز معلوم ہوا کہ حضرت گنگوہ تشریف لے گئے ہیں۔ فوراً جلسہ بلایا گیا اور طے شدہ منصوبے کے مطابق مقدمہ کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ انگریزی عدالتوں کی طرح بہ قول رشید احمد صدیقی "شیطان حق پر اور فرشتہ ناحق پر تھا۔"

مولانا سندھی نے اندازہ کیا کہ اس ماحول میں وہ جمعیت الانصار کے کام کو جاری نہیں رکھ سکیں گے، چنانچہ انھوں نے جمعیت الانصار کی نظامت سے استعفا دے دیا۔ استعفے کی عبارت سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اختلاف دور نہیں ہوا تھا اور مولانا سندھی کی توبہ قبول نہیں ہوئی تھی۔ مولانا سندھی کا یہ استعفا یا تاریخی خط جو انھوں نے جمعیت کے صدر مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نائب مہتمم کو خط لکھا تھا اس کی ابتدائی سطریں یہ ہیں:

"معروض آں کہ جلسہ انتظامیہ کے تمام ممبر جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے، میری نسبت اچھے خیالات نہیں رکھتے۔ اگر جامعۃ القاسمیہ تک معاملات کا مرافعہ کیا جائے اور میں اپنی

برات ثابت کرلوں۔ تو بھی اتفاق سے کام چلانا مشکل ہے۔ لہذا جمعیت الانصار کی خدمت سے استعفا پیش کرتا ہوں"۔

مولانا سندھی کا یہ خط ۱۱ مئی ۱۹۱۳ء کا یادگار ہے۔

تبلیغ کا مسئلہ جو کچھ اور جیسا کچھ بھی تھا، مولانا گیلانی کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ محکمۂ احتساب کی کارروائی اور فیصلے کے بعد بھی ذہن صاف اور قلب مطمئن نہیں ہوئے تھے۔ مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

"مجلس (یعنی جلسۂ احتساب) برخاست ہوگئی لیکن اس سے میرا دل بے حد متاثر تھا۔

غالباً دوسرے دن یا ایک دو دن بعد جب حضرت شیخ الہند کے درس میں ترمذی شریف کا دورہ شروع تھا تو اس فقیر نے بہ جرأتِ رندانہ یہ مسئلہ دہرایا کہ اس وقت جو تبلیغ کے باب میں اختلاف سا ہوگیا ہے۔ حضور والا شان اس کی بابت کیا فرماتے ہیں؟ .... بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے جلسوں کی تقریروں کی خبریں حضور تک بھی پہنچی تھیں، جن سے وہ متاثر تھے"۔

مولانا مناظر لکھتے ہیں کہ:

"آپ نے ایک ایسی شستہ و رفتہ تقریر میں یہ مسئلہ بیان فرمایا جو بندے کے نزدیک حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے، آپ کی اس تقریر کے آخری الفاظ یہ ہیں۔

"الغرض انفرادی طور پر یہ بات کہ تبلیغ کس کو کس درجے کی ہوئی ہے۔ حق تعالیٰ سبحانہ ہی اسے جانتے ہیں اور مواخذہ بھی وہی اپنے علم کے مطابق کریں گے .... اشخاص کو متعین کرکے یہ بتانا آدمی کے لیے ناممکن ہے کہ کس کو کس درجے کی تبلیغ ہوئی اور حسب تبلیغ کے مدارج کا تفصیلی علم نہیں ہوسکتا تو مواخذہ کی تفصیل بھی ہم کیسے کرسکتے ہیں"۔

مولانا گیلانی کے بقول "حضرت شیخ کی اسی تقریر پر کافی شور و غوغا ہوا اور اس سے جو غلط فہمی پھیلنے کا اندیشہ تھا، اس کے ازالے کے لیے ایک جلسہ بھی طلب کیا گیا"۔ اس بیان سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت شیخ الہند کی رائے مولانا سندھی کی رائے کے موافق تھی یا کم از کم اس کے خلاف ہرگز نہ تھی اور یہ کہ حضرت شیخ الہند اربابِ اہتمام اور ان کے حواریوں کی رائے اور رد و قبول سے ہرگز متفق نہ تھے اس بات کا یقین حضرت کے اس رویے سے بہ خوبی ہوجاتا ہے جس کا اظہار حضرت نے مولانا انور شاہ کاشمیری سے ناراضگی کی صورت میں کیا تھا۔ اور مولانا اسعد مدنی کے حوالے سے اسی مضمون کی گزشتہ سطروں میں آچکا ہے۔ اس کے بعد خود

حضرت علامہ کاشمیریؒ کا احساسِ ندامت اور معذرت و عفو خواہی نے تو صاف صاف اس بات کا اعلان کر دیا کہ یہ محض ایک ڈرامہ تھا جو ارباب اہتمام نے اور عثمانی خاندان کے بعض افراد نے کھیلا گیا تھا۔ اور حضرت علامہ کاشمیری محض غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔

پھر اس فتوے کو "فتاویٰ دارالعلوم" میں شامل نہ کرنا خود اس بات کا غماز ہے کہ فتویٰ غلط تھا۔ اس طرح دارالعلوم کے ارباب بست وکشاد اور اصحاب علم کے رویے سے مولانا سندھی مرحوم کی برّیت اور ان کا حق پر ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔

اب اگر مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کی تضلیل و تکفیر اور انہیں دیوبند سے نکلوانے کا پس منظر تبلیغ کے باب میں ان کے خیالات و عقائد نہیں تھے تو حقیقت کیا تھی۔ اس مسئلے پر اس سلسلۂ بحث کے آخر میں روشنی ڈالی جائے گی۔

اس سلسلے میں دارالعلوم میں جو کارروائی بھی ہوئی تھی وہ ارباب اہتمام کے ایما سے اور عین ان کی مرضی کے مطابق عمل میں آئی تھی۔ لیکن وہ اب بھی مطمئن نہ تھے۔ چنانچہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نائب مہتمم دارالعلوم نے ایک روز مولانا مناظر احسن گیلانی کو جو اس زمانے میں دارالعلوم میں زیر تعلیم تھے، بلایا اور ان سے کہا:

"تم حضرت سے مل کر معلوم کرو کہ واقعی سیاسیات میں حضرت والا کا صحیح مسلک کیا ہے؟"

چنانچہ مولانا گیلانی حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دریافت فرمایا۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ پیغام سنتے ہی میں نے دیکھا کہ حضرت پر ایک خاص حال طاری ہے اور ارشاد فرمایا:

"حضرت الاستاد (حضرت نانوتوی) نے اس مدرسہ کو کیا درس و تدریس اور تعلیم و تعلّم کے لیے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے"۔

آخر میں ارشاد فرمایا:

"صرف تعلیم و تعلّم اور درس و تدریس ہی جن کا مقصد اور نصب العین ہے میں ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوں، لیکن اپنے لیے تو اسی راہ کا انتخاب میں نے کیا ہے جس کے لیے

دارالعلوم کا یہ نظام میرے نزدیک حضرت الاستاذ نے قائم کیا تھا" (سوانح قاسمی جلد ۲ ص ۲۲۶)

مولانا گیلانی مرحوم نے بھی اس بات کو "دارالعلوم کی اساسی خصوصیت" تسلیم کیا ہے وہ لکھتے ہیں:۔

"مدرسہ دیوبند کی یہی وہ "اساسی خصوصیت" تھی جس نے اس مدرسے کے تمام کاروبار حتیٰ کہ تعلیم میں بھی ایسی ہی حریت پرزور خصوصیات پیدا کیں اور وہ دینی و مذہبی حمیت و غیرت کا ہندگیر، ہی نہیں عالم گیر جامعہ اور اقامتی ادارہ بن گیا۔ اس کے فضلا کا ایک خاص مکتب خیال نمایاں ہوا، اور اس کے مستفیدین ایک ایسا خاص ملا جلا اور مرکب نصب العین لے کر باہر نکلے، جس میں سب پر چھا جانے کی اسپرٹ موجود تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ "اساسی خصوصیت" حضرت والا کے سوا کسی کے سامنے نہ تھی اور نہ ہی ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے، جو اس وقت سامنے تھے، ہر ایک سے اتنی بلند نظری کی توقع ہی کی جاسکتی تھی"۔ (ایضاً ص ۲۷-۲۲۶)

اسی سلسلے میں مولانا گیلانیؒ لکھتے ہیں:

"اس کے بعد دو راہیں مختلف ہوگئیں ایک راہ تعلیم و تعلّم و دینی نشر و اشاعت کی اور دوسری وہی جس کو حضرت شیخ الہند نے اختیار فرمایا اور اسی مسلک پر اپنے مالک سے جا ملے۔ خیال آتا ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ فالفضل اللّٰہیہ جس قدر بن پڑا ادا کرتا رہا، اب آخری کام یہی رہ گیا ہے، جسے اپنی حد تک تو کر گزروں گا۔ اور اسی کو وہ کر گزرے۔

خاکسار نے جو کچھ سنا تھا، ان لوگوں تک پہنچا دیا جنھوں نے پیغام رسانی کا یہ مطالبہ کیا تھا"۔

اب تو "تاریخ دارالعلوم" کے مقدمہ میں مولانا قاری محمد طیب مرحوم نے مولانا گیلانی کی اس روایت کا حوالہ دے کر دارالعلوم کے نصب العین کی جامعیت اور مقاصد کی ہمہ گیری کے اس پہلو کو تسلیم کر لیا ہے اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور آپ کے شاگرد رشید امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کی سیاسی خدمات کا اعتراف بھی کر لیا ہے۔

ہندو مسلم اتحاد

دوسرا مسئلہ جو مولانا عبیداللہ مرحوم کے خلاف الزامات کی فہرست میں نظر آتا ہے اور ان کے خلاف

ہنگامے، ان کی تضلیل وتکفیر اور دیوبند سے ان کے اخراج کا سبب بنا" ہندو مسلم اتحاد" کے بارے میں ان کے مساعی تھے۔

ہندو مسلم اتحاد ہندوستان میں ایک اہم مسئلہ رہا ہے۔ اس مسئلے کے دو پہلو ہیں:

۱۔ ۱۹۴۷ء سے قبل ملک کی آزادی کے لیے اور ۱۹۴۷ء کے بعد ملک کی عمومی تعمیر وترقی کے لیے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت واہمیت

۲۔ عام معاشرتی، سماجی اور تمدنی زندگی میں ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت اور اس کی اہمیت

انگریزوں نے اپنے قصر عالی شان کی بنیاد "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے اصول پر رکھی تھی۔ اس مقصد کے لیے اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑوایا اور اس کے لیے اس نے تاریخی، سماجی، تمدنی، تہذیبی اور مذہبی اختلافات کو ہوا دی، نزاعات کو بڑھایا اور ہندوستان کی سماجی زندگی میں دو حلیف قوموں کے بجائے دو مخالف اور متحارب قوموں کی تعمیر وتشکیل اور تنظیم کے لیے ہر حربہ استعمال کیا ہندوؤں اور ہندوؤں میں اختلافات ونزاعات پیدا کیے۔ مسلمانوں مسلمانوں کو ایک دوسرے سے لڑایا اور کمزور سیرت کے بعض علما سے کام لے کر بعض علمی وفکری مسائل کو عوام میں اچھال کر انتشار پیدا کیا اور ایک مکتبۂ فکر اور فرقے کو دوسرے کے خلاف منظم اور مستحکم کیا۔ مختلف فرقوں اور سماجی طبقات کو ایک دوسرے سے لڑایا اور اس کے نتیجے میں جو حالات پیدا ہوئے، ان سے اپنی حکومت کے استحکام اور اقتدار کو دوام بخشنے کا کام لیا۔

ہمارے بزرگوں نے شروع ہی سے انگریزوں کی اس ڈپلومیسی کو سمجھ لیا تھا۔ اور وہ غور وفکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ انگریزوں کے اقتدار سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہر سطح پر اتفاق واتحاد کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے انھوں نے سعی بھی کی۔

انیسویں صدی کے آغاز میں جب سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید نے تحریک جہاد اور احیاے حکومت اسلامی وقومی کا آغاز کیا تو اس میں ہندوؤں کے تعاون کی ضرورت کا احساس اسی شعوری فیصلے کا نتیجہ تھا اور ۱۸۵۷ء میں ہندوؤں کے ساتھ مل کر آزادی کی جنگ لڑنا اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی اور جب حضرت شیخ الہند نے جب اس وادی میں قدم رکھا تو انھیں پہلے دن سے احساس تھا کہ ملک کی آزادی کا خواب ہرگز شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ جب تک ملک کی مختلف اقوام اختلاف کو اتحاد سے بدل نہیں دیا جاتا۔

حضرت شیخ الہند کے بعد حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی اور دیوبند کے انقلابیوں اور ملک کے

تمام مسلمان حریت پسندوں مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبیداللہ سندھی کی سیاست کی بنیاد بھی اسی اصول پر قائم تھی کہ ہندو مسلم اختلافات پیدا کرکے ملک کی تیسری قوت کو مستحکم ہونے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس اصولِ سیاست کی بنیاد حکیم الہند شاہ ولی اللہ دہلوی کے فلسفۂ عمرانیات میں تلاش کرنی چاہیے۔ اسلام کے اس عظیم فلسفی نے پہلی بار معاشرے کی تشکیل کے اصولوں پر مسلم اور غیر مسلم نقطۂ نظر کے بجائے انسانی نقطۂ نظر سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ایک اچھی معاشرتی زندگی جس میں اس کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کے بعد ہر شخص کو اتنا وقت ملے کہ وہ اپنے بچوں کی بہترین تعلیم و تربیت کے ساتھ اپنی روحانی ترقی کے لیے بھی وقت نکال سکے، انسان کا حق ہے، نہ کہ کسی خاص قوم مسلمان یا غیر مسلمان کا! انسانیت کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ رفاہیت ناقصہ اور رفاہیت بالغہ کی جگہ رفاہیت متوسطہ کو پیدا کیا جائے۔ یہ بات انھوں نے بتائی کہ جس طرح رفاہیت ناقصہ حیوانی زندگی کو جنم دیتی ہے اسی طرح رفاہیت بالغہ غیر اخلاقی زندگی کا سرچشمہ بنتی ہے اور اس کی مہلکات نہ صرف مسلمانوں کی اخلاقیات کی تاراجی کا باعث ہوتے ہیں بلکہ پورا معاشرہ ان انسانی اقدار سے محروم ہو جاتا ہے جس کے بعد انسانی معاشرے کی تاراجی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

ہندوستان میں صدیوں سے مسلمانوں کے تہذیبی اور جاگیردارانہ نظام نے مسلمانوں میں اخلاق و سیرت کی جو خرابیاں پیدا کر دی تھیں اور غیر مسلموں کے امرائے سوا ان کے عوام رفاہیت ناقصہ میں مبتلا ہو کر حیوانی زندگی کی اس سطح تک پہنچ گئے تھے کہ ان میں انسانی اخلاق اور تہذیبی زندگی کی کوئی قدر باقی نہیں رہ گئی تھی وہ ایک قوت تھے، لیکن امرائے قوم کے ہاتھ میں محض ایک آلے کی حیثیت رکھتے تھے امرا انھیں اپنے مفاد اور مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے۔ خود انھیں اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ انھیں کہاں اور کن مقاصد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ انھیں اچھے برے اور غلط صحیح سے کوئی سروکار نہ ہوتا تھا۔ اسی طرح مسلمانوں میں بھی ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا، جسے امرا اپنے مفاد اور اغراض کے لیے استعمال کرتے تھے اور پھر ان کے پرسان حال نہ ہوتے تھے۔ ان کی ضروریات انھیں مجبور کرتی تھیں کہ دوسری بار وہ اپنے پہلے مفتوح کے جھنڈے کے نیچے پہلے فاتح سے فلاں لڑیں اور اُسے فتح دلا دیں۔ جنگ کے جواز یا عدم جواز یا حق اور ناحق سے انھیں کوئی غرض نہ ہوتی تھی۔ کل انسانی مفادات کا تصور تو دور کی

بات تھی انھیں مسلمانوں کے اجتماعی مفادات سے بھی کوئی غرض نہ ہوتی تھی وہ خود سوچنے اور فیصلہ کرنے کے حق سے گویا دست بردار ہوگئے تھے۔

حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد شاہ ولی اللہ دہلوی اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اب ہندوستان میں سیاسی انقلاب ناگزیر ہوگیا ہے اور اصول انقلاب کے مطابق معاشرتی انقلاب بھی اس کا لازمہ ہے ضروری ہے کہ آئندہ ملک کے حالات بدل جائیں اور امیروں اور جاگیرداروں کا طبقہ ذلیل و خوار ہوجائے اور "اذلہ" میں شمار ہونے لگے اور معاشرے کے نچلے ہوئے طبقات معاشرے کی اوپر کی سطح پر آکر صاحب عزت و اعزہ" بن جائیں شاہ ولی اللہ کی بصیرت نے انھیں بتادیا تھا کہ ملک کی موجودہ سوسائٹی کی تباہی لازمی ہے۔ اب محض تجدید احیا کی کوئی سعی مشکور نہ ہوگی۔ اس لیے انھوں نے "تنک کل نظام" کی دعوت دی تھی۔ بلاشبہ انسانی اصولوں، ایک نئے معاشرے یا جدید ہندوستان کی تعمیر کے اصول و اقدار کی طرف ان کی "مومنانہ فراست" اور اسلامی تعلیمات میں ان کی مجتہدانہ بصیرت نے رہنمائی کی تھی اور ان کے اصول و مبادی انسانی اور اسلامی فلسفہ و اخلاقیات میں کوئی تعارض نہ تھا لیکن ان کے تدبر و بصیرت نے ان پر اس حقیقت کا انکشاف کیا ہی کردیا تھا کہ ملک کے آیندہ سیاسی و معاشرتی نظام کی شکل شاید وہ نہ ہو جو ماضی میں رہ چکی ہے اور جسے مسلمانوں کی نظریں "اسلامی" سمجھنے میں دھوکہ کھاتی رہیں ہیں۔

شاہ ولی اللہ دہلوی ہندوستان کے پہلے فلسفی اور حکیم ہیں جنھوں نے معاشرے کی ایسی انسانی اور اخلاقی تنظیم کی طرف توجہ دلائی جس کے افراد انسان ہو نہ کہ مسلمان اور غیر مسلمان۔

دیوبند کے انقلابی بزرگ اس حقیقت سے سب سے زیادہ آشنا تھے اس لیے شروع ہی میں ملک کی سیاسی و سماجی زندگی میں مسلمان اور غیر مسلمان کی تفریق کو ماننے سے انکار کردیا تھا اور مسلمانوں کی دینی، تہذیبی اور اجتماعی زندگی اور مفادات سے کسی ادنا جز کو بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے لیکن ملک کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی زندگی میں کسی ایسے رویے کو بھی اپنانے کے لیے تیار نہ ہوسکے جس کا نقصان ملک کی سماجی زندگی کو اور فائدہ ملک کی قابض تنظیمی قوت کو پہنچے۔

ممکن ہے ان کے انداز فکر میں کسی مقام پر کوئی خامی رہ گئی ہو لیکن نہ صرف ان کا، ان کے بزرگوں کا بھی طرز یہی رہا تھا اور وہ اپنے اس انداز فکر اور فیصلے میں مخلص تھے۔ ہندوستان کے غیر مسلموں سے اتحاد محض ایک سیاسی ضرورت ہی نہ تھی بلکہ مسلمانوں کی بہترین اجتماعی ملی اور ان کے اقتصادی مفادات کا تقاضا بھی یہی تھا

اور تبلیغ و اشاعت اسلام کے لیے بھی ضروری تھا کہ غیر مسلموں سے اختلافات و تنازعات کے بجائے اتحاد اور ملک میں فتنہ و فساد کے بجائے ہر طرف امن و امان ہو۔

اتحاد و امن و امان ہی کی صورت میں مسلمان اپنے کاروبار کو پھیلا سکتے تھے، زراعت کو ترقی دے سکتے تھے، وسائل معاش کی تگ و دو میں حصہ لے سکتے تھے اور اپنی اقتصادیات کو درست کر سکتے تھے۔ اسی پر ان کی ملی، معاشرتی، تہذیبی، تعلیمی سرگرمیوں کا دارومدار تھا۔ امن و اتحاد کے بغیر وہ تمدنی زندگی کی راحتوں اور پرسکون گھریلو زندگی کی مسرتوں سے بھی لطف اندوز نہیں ہو سکتے تھے۔ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے بہترین مواقع بھی اسی صورت میں مہیا ہو سکتے تھے۔

ہندو اور مسلمان اس ملک میں صدیوں سے رہتے آئے تھے ان میں ہزاروں بار اختلافات ہوئے تھے اور جنگ و جدل کی نوبت بھی آئی تھی آئندہ بھی ان امکانات کو رد نہیں کیا جا سکتا لیکن ہمیشہ کے لیے اختلافات و انتشار اور فساد و جنگ و جدل کی صورت کو گوارا نہیں کیا جا سکتا تھا یہ بات نہ مسلمانوں کے مفاد میں تھی، نہ ہندوؤں کے فائدے میں۔ امن و اتحاد ہی ان کی قومی و ملکی اور اجتماعی اقتصادی ترقی و استحکام کا ضامن تھا اور مسلمان اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتے تھے۔ ملک میں امن اور اس میں بسنے والی اقوام سے مسلمانوں کا اتحاد ماضی میں بھی ان کی ضرورت تھا، حال میں بھی ان کا فائدہ اسی میں ہے اور مستقبل میں بھی وہ امن اور اتحاد کی ضرورت سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی دونوں طرح کی فلاح و بہبود کا راستہ امن و اتحاد کی فضا ہی میں طے کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں مسلمان اپنی دنیاوی زندگی کے کسی پہلو سے صرف نظر کر سکتے ہیں، لیکن امن و اتحاد کی ضرورت سے کبھی بےفکر نہیں ہو سکتے۔

لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بیسویں صدی کے ہندوستان میں کچھ ایسے ہندو ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو طاقت کے ذریعے ختم کر سکتے ہیں اور ایسے مسلمان بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوؤں کو غلام بنایا جا سکتا ہے۔ حالاں کہ اب نہ ان کے پاس حکومت ہے، نہ اقتدار، نہ اقتصادی و معاشی استحکام انھیں حاصل ہے ان کی اجتماعی و ملی زندگی کا شیرازہ بکھر چکا ہے حتیٰ کہ اب وہ اخلاقی قوت سے بھی عاری ہو چکے ہیں۔

اس کے باوجود اگر کوئی مسلمان یا مسلمانوں کی کوئی جماعت یہ سمجھتی ہے کہ وہ ایسا کر سکتی ہے تو اس کے عزائم کی بلندی کو خراج عقیدت پیش کیا جا سکتا ہے لیکن عملی دنیا میں ان کی آرزوؤں کی کیا حیثیت ہے

یہ سوچنے کی بات ہے۔ بہرصورت حالات یہ تھے کہ مسلمان اور ہندوؤں — دونوں میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا تھا جو اپنی ناسمجھی سے مذہبی جوش میں دونوں قوموں کے مابین اختلافات کو ہوا دے رہا تھا فتنہ و فساد پھیلا رہا تھا، برٹش ڈپلومیسی کا آلہ کار بنا ہوا تھا اور نہایت شرمناک بات یہ تھی کہ اس کے لیے مذہب کے نام کو استعمال کر رہے تھے۔

مولانا عبیداللہ سندھی نے شیخ الہند کی ہدایت کے مطابق مولانا محمد علی کے تعاون سے ہندو مسلم اتحاد کی تحریک شروع کی تھی۔ یہ بات دارالعلوم کے مہتمم اور عثمانی خاندان کے بزرگوں کو سخت ناگوار تھی، لیکن اس کا افسوسناک پہلو یہ تھا کہ یہ بزرگ فکر و رائے کے اشخاص نہ تھے بلکہ انگریزوں کے ایجنٹ تھے۔

قدیم و جدید کی خلیج :

مسلم ہندوستان میں ایک ہی نظام اور نصاب تعلیم رائج تھا۔ اس سے نکل کر لوگ اپنے اپنے ذوق کے مطابق انتظامیہ، عدلیہ، تجارت، زراعت، صنعت، حرفت، تصنیف و تالیف، درس و تدریس، دعوت و ارشاد، دینی و ملی اور قومی و ملکی خدمات سے مختلف میدانوں کا انتخاب کرتے تھے، ہر شخص پر اس کے ذوق، استعداد اور محنت کے مطابق ترقی اور کامیابی کی راہیں کھلی ہوئی تھیں۔ قدیم و جدید کی کوئی تفریق نہ تھی۔ سرسید، نذیر احمد، حالی، محسن الملک، وقار الملک وغیرہم سب نے ایک ہی نصاب پڑھا تھا اور اپنے اپنے ذوق و صلاحیتوں کے مطابق قومی و ملکی زندگی میں بلند مقام حاصل کیا تھا انگریزوں کے لیے یہ نظام تعلیم نامانوس اور ان کے مصالح کے خلاف تھا۔ انگریز رفتہ رفتہ نظام تعلیم میں جو تبدیلیاں لائے اس نے ملک کو قدیم و جدید، دو حصوں یا طبقوں میں تقسیم کر دیا، ایک طبقہ رجعت پسندوں اور تنگ نظر اور زندگی کے بارے میں محدود تصور رکھنے والا کہلایا تو دوسرا ترقی پسند اور روشن خیال کہلایا، کچھ لوگ قدامت پرست تھے، اور اپنے قدیم نظام کو سینے سے لگائے ہوئے تھے، کچھ جدید تھے جنھوں نے سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کی تھی۔ پہلوں پر رفتہ رفتہ حکومت کے ذریعے معاش کے دروازے بند ہوتے چلے گئے، دوسروں پر معاش کی راہیں کھلتی گئیں ان دونوں میں نہ صرف فکر و نظر کا اختلاف پیدا ہوگیا بلکہ معاشی حیثیت سے بھی دو طبقے بن گئے اور دونوں کا سماجی حیثیت میں بھی زمین و آسمان کا فرق پیدا ہوگیا تھا پہلے مذہب پرست اور دین دار کہلائے تو دوسرے دنیا دار بلکہ بے دین مشہور ہوئے حالاں کہ نہ پہلوں میں سب دین دار تھے اور نہ دوسروں میں سب دنیا دار اور بے دین تھے لیکن ہوا یہ کہ مسلمانوں کی اجتماعی قوت

دو متخالف بلکہ متحارب فریقوں میں تقسیم ہو گئی۔

دونوں فریق اپنی اپنی جگہ مطمئن تھے اور کسی کو مسلمانوں کی اجتماعی قوت کی تقسیم اور اس کے نقصان کا احساس نہ تھا۔ لیکن دین دار قوم کے واقعی دردمندوں اور سچے غم گساروں سے خالی نہ ہو گئی تھی۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قوم کے انہی دردمندوں اور غم گساروں میں سے تھے ان کی آنکھیں ملت کی بہترین صلاحیتوں اور قوتوں کے ضیاع پر اشک افشاں تھیں وہ چاہتے تھے کہ ملت کے یہ دونوں طبقے قومی اور اجتماعی و ملی زندگی میں ایک دوسرے کی طاقت بن جائیں اور ان کی قوتیں اور صلاحیتیں ملت کے بہترین مقاصد کے حصول اور قوم و وطن کی تعمیر میں صرف ہوں اور ان کے اختلاف و انتشار سے برٹش استعمار کسی قسم کا فائدہ نہ اٹھا سکے۔ حضرت شیخ الہند نے اس جدید تعلیم یافتہ طبقے کی طرف ہاتھ بڑھایا اسے اپنے ساتھ ملانے اور دونوں کے مابین خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی۔ مسلم یونی ورسٹی کے صاحب زادہ آفتاب احمد خاں کو دارالعلوم آنے کی دعوت دی آپ کی مساعی سے ایک معاہدہ طے پایا[1] کہ دارالعلوم کے طلبہ علی گڑھ جائیں گے اور ایک مختصر مدت میں انگریزی کے ایک مخصوص نصاب کی تکمیل کریں گے اور علی گڑھ کے فارغ التحصیل دیوبند آئیں گے اور ایک مختصر مدت میں عربی زبان اور اسلامیات و قرآن کے ایک خاص نصاب کی تکمیل کریں گے اگرچہ اس معاہدے کے تحت جو پہلا طالب علم انیس احمد دیوبند آیا وہ سی آئی ڈی کا شخص تھا۔ اس کی وجہ سے جو مشکلات پیدا ہوئیں اور اس نے اپنی خدمات کا جو سلسلہ پایا، وہ ایک الگ موضوع ہے۔ لیکن اس شخص کے اعمال کے لیے علی گڑھ کو الزام نہیں دیا جا سکتا اور نہ اس سے معاہدے کی عدم افادیت پر استدلال کیا جا سکتا ہے علی گڑھ کے ایک طالب علم نے انگریز کے لیے جاسوسی کا فریضہ انجام دیا تھا تو دارالعلوم کا محکمہ اہتمام اس سے زیادہ گھٹیا انداز میں جاسوسی اور رپورٹنگ کے ذریعے یہی خدمت انجام دے رہا تھا۔

سی آئی ڈی کی ملازمت کو تو کسی نے حرام قرار نہیں دیا تھا۔ انیس احمد کے فرائض منصبی میں شامل تھا کہ وہ دیوبند اور اس کے بزرگوں کے حالات سے اپنی گورنمنٹ کو مطلع کرے۔ اس کے لیے یہ کوئی جرم نہیں

---

[1] ۱۹۱۰ھ میں دارالعلوم دیوبند کے جلسۂ دستار بندی میں صاحبزادہ مرحوم نے شرکت اور علی گڑھ کی نمائندگی فرمائی تھی اور حضرت شیخ الہند سے مشورے کے بعد دونوں دارالعلوموں میں ربط ان کے طلبہ کے تبادلے اور تعلیم کے مخصوص نصاب کے تحت تعلیم کی ضرورت کی تجویز صاحب زادہ مرحوم ہی نے پیش کی تھی۔ (علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے از، مولانا سید محمد میاں۔ حصہ اول ص ۱۳۱)۔

تھا۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے بھائی مولوی مظہر علی بھی سی آئی ڈی کے محکمے میں ملازم تھے۔ اگر یہ ملازمت حرام ہوتی تو حضرت تھانوی انھیں ملازمت کرنے کیوں دیتے۔ بلکہ وہ اس کے حرام ہونے کا فتویٰ دے دیتے اگر سی آئی ڈی کی ملازمت حرام نہیں تھی تو ملازمت کے فرائض ذمہ داری، دیانت داری اور خوش اسلوبی سے ادا کرنا شرعی طور پر فرض تھا۔ مولوی مظہر علی نے بھی دیوبند اور سہارن پور کے اس ماحول میں اور اسی زمانے میں اپنے فرائض منصبی ادا کیے تھے۔ انھوں نے تو اپنے بھائی حضرت تھانوی کے ذریعے دارالعلوم اور حضرت شیخ الہند کے بارے میں بہت سی خفیہ معلومات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ دیوبند کے بزرگوں کو اس بات کا بہت رنج تھا، لیکن انھوں نے بھی سی آئی ڈی کی ملازمت کو حرام قرار نہیں دیا۔

انیس احمد اور مولوی مظہر علی تھانوی کی ملازمت اور ان کی جاسوسانہ سرگرمیوں کے لیے تو میں نے جواز پیدا کر دیا لیکن شمس العلماء حافظ محمد احمد کے خفیہ خبر رسانی کے اعمال کا کیا جواز تھا۔ ان کے فرائض منصبی میں تو یہ بات شامل تھی۔ انھوں نے نہایت شرم ناک اخلاقی اور قومی و ملی جرم کیا تھا۔ اتنا بڑا جرم کہ قاسمی، عثمانی، یا فاروقی، تھانوی خاندان اور دیوبند، علی گڑھ، لاہور کے کسی دارالعلوم یا جامعہ کا کوئی مفتی آج بھی اس کے جواز کا فتویٰ نہیں دے سکتا۔

ہمیں اس بات کو نظر انداز نہیں کر دینا چاہیے کہ علی گڑھ اور دیوبند معاہدے سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک تیسری قوت تاک میں تھی۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور اس معاہدے کی ناکامی کا نقصان مسلمانوں کے حصے میں آیا۔

بہرحال علی گڑھ اور دیوبند کا یہ معاہدہ حضرت شیخ الہند کی بصیرت، قومی درد مندی، بلند خیالی، اور علو ہمت پر شاہد عدل ہے۔ اس کے بعد ۱۹۱۲ء میں ترکِ موالات کے زمانے میں نیشنل یونی ورسٹی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) کے افتتاح کے موقع پر حضرت نے جو خطبہ دیا تھا۔ اس میں تو گویا آپ نے اپنے دردمند قلب کے ٹکڑوں کو صفحۂ کاغذ پر پھیلا دیا ہے، یہ خطبہ آپ کی قومی غم گساری اور دردمندی کا بہت بڑا ثبوت ہے۔

انگریزوں نے ہندوستان میں جو نظام تعلیم رائج کیا تھا اور اس کے جو تلخ نتائج سامنے آئے تھے۔ اور ملتِ اسلامیہ کی اجتماعی قوت جس طرح دو مخالف و متحارب فریقوں میں تقسیم ہو گئی تھی، اس میں انگریزوں کی خوشی کا بہت سروسامان تھا لیکن حضرت شیخ الہند اور دوسرے دردمندان قوم جو قدیم اور جدید تعلیم یافتہ دونوں طبقوں میں تھے۔ اس تفریق اور تشتت سے اتنے ہی غم گیں تھے۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے حضرت شیخ الہند کے ایما اور مشورے سے اس کی تفریق کو مٹانا، نشست کو دور کرنا اور مابین تبلیغ کو پاٹنا چاہا تھا۔ جمعیت الانصار کے تحت علی گڑھ کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا جو انتظام کیا گیا تھا، ان کے لیے معقول وظائف کا بندوبست کیا گیا تھا اور جس طرح انھیں قوم کا قیمتی سرمایہ سمجھ کر ان کی عزت و توقیر کی جاتی تھی، اسے بعض متقشف علما اور دارالعلوم کے ارباب اہتمام سخت ناپسند کرتے تھے۔ اس لیے یہ جذبہ بھی مولانا عبید اللہ سندھی کی مخالفت میں شدت کا باعث ہوئی اور دونوں دیدات میں اس نظام ہی کو تہس نہس کر دیا گیا۔ خواہ اس مخالفت میں انگریزوں کی کا جذبہ شامل نہ ہو اور خواہ اس مخالفت کی وجہ ان کی دین داری کا جذبہ ہی کیوں نہ ہو، لیکن اس مخالفت کا، جس کا نشانہ مولانا سندھی مرحوم کو بنایا گیا تھا، فائدہ تو برٹش حکومت ہی کے حصے میں آیا۔ اب اگر اس میں انگریزی حکومت کی خوشنودی اور اس کی وفاداری و خدمت گزاری کا جذبہ بھی شامل تھا اور یقین ہے کہ ایسا تھا اور اس عمل کے پیچھے حکومت کا اشارہ بھی موجود تھا تو بڑے شرم کی بات تھی۔ اس کے لیے ارباب اہتمام اور ان کے ہم خیال دیوبند کے عثمانی خاندان، نفانہ بھون کے فاروقی خاندان اور دیگر علما کو تاریخ معاف نہیں کر سکتی۔

مولانا محمد علی کا اکرام اور قدر افزائی:

علی گڑھ سے تعلیم یافتہ نسل میں، جس نے سر سید مرحوم کی آنکھیں دیکھی تھیں، مولانا محمد علی (رام پوری) اپنے قومی جذبے، حریت پسندی، ملی غیرت، دینی حمیت، ذوقِ حق گوئی، جہاد اور استعمار دشمنی کی بنا پر غیر معمولی صلاحیتوں اور خوبیوں کے مالک شخصیت تھے۔ انھوں نے علی گڑھ میں انگریز پرستی اور استعمار دوستی کے ماحول میں تعلیم پائی تھی، لیکن ان کی فطرت کے جوہر سعادت نے ان کی رہنمائی کی، نیرو زبختی نے سہارا دیا، اقبال مندی نے آگے بڑھایا۔ کھلی آنکھوں سے زمانے کے انقلاب اور ہندوستان کے بدلتے ہوئے حالات کو دیکھا اور حریت نوازی اور استعمار دشمنی کی راہ پر چل کھڑے ہوئے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن سے تعارف ہوا تو ان کے علم و تقویٰ، ذوقِ جہاد، آزادی اور حریت پروری سے ایسے متاثر ہوئے کہ ہمیشہ کے لیے حضرت کے ارادت مندوں اور عقیدت کیشوں میں شامل ہو گئے۔ حضرت علیہ الرحمہ کو ایسے نوجوانوں اور قوم کے جاں نثاروں کی تلاش رہتی تھی۔ حضرت نے ان کے جذبہ حریت کو سراہا، ذوقِ جہاد آزادی کی تربیت کی اور قومی و ملی رنگ کو پختہ سے پختہ تر کر دیا۔ حضرت شیخ الہند ان کی قابلیت کے قائل اور صلاحیت کے معترف تھے۔ اگرچہ بہت سے جدید تعلیم یافتہ حضرت قوم و ملت کی توقعات پر پورے نہیں اترے تھے لیکن حضرت کو

امید تھی کہ اس خاکستر میں کوئی جوہرِ قابل بھی چھپا ہوگا، جس کی درخشانی سے ایک روز قوم کا مقدر جگمگا اٹھے گا۔ حضرت کی نظر جوہر شناس نے ایک نہیں کئی جوہر قابل تلاش کیے اور اپنی نظر کیمیا اثر سے انھیں قوم و ملت کے آسمان کے جگمگاتے ہوئے ستارے بنا دیا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری، تصدق احمد خان شیروانی، عبدالمجید خواجہ، حسرت موہانی، شوکت علی، محمد علی، ظفر علی خان، مولانا حمیدالدین فراہی، مظہرالحق وغیرہم ایسے ہی جوہر قابل تھے جن پر قوم و ملت کو فخر ہے یہ سب وہ لوگ ہیں، جنھوں نے جدید تعلیم کی تحریک کے دورِ عروج میں ہوش سنبھالا تھا اور علی گڑھ کی استعمار پسندانہ اور انگریز پرستانہ تحریک سے بہت تھوڑے اثرات قبول کیے تھے ان میں مولانا محمد علی اپنی علمی و عملی صلاحیتوں اور جوشِ ملی و قومی، حریتِ فکر اور حمیت دینی میں ایک خاص ذوق و بصیرت کی شخصیت تھے۔

یہ تحقیق اس وقت ہمارا موضوع نہیں کہ مولانا محمد علی کی سعادت مندی اور تیر دوز نحتی الفیس حضرت شیخ الہند کے حصہ میں سے گئی تھی! حضرت کی کمند فکر نے اس بلند پرواز شاہین کو اپنی نظر و بصیرت کا اسیر اور ذوقِ حریت اور فنِ ملی و خیر خواہی کا شیدا بنا لیا تھا۔ یہ حقیقت ہماری نظروں کے سامنے اور ہماری دلچسپی کا موضوع ہے کہ مولانا محمد علی حضرتِ شیخ الہند سے نسبت و ارادت اور نہایت عقیدت رکھتے ہیں اور حضرت اُن مرحوم کی صلاحیتوں کے قدرداں ہیں اور ان کی علمی قابلیت، علمی استعداد اور ذوقِ حریت نوازی سے قومی تحریک آزادی کے روشن مستقبل کی بہترین توقعات رکھتے ہیں۔ اُن کے جوہر بصیرت کی تربیت فرماتے ہیں۔ ان کی قدرافزائی کرتے ہیں اور ایک موقع پر اپنے سر سے عمامہ اتارتے ہیں اور مولانا محمد علی کے سر پہ باندھ دیتے ہیں۔ خرد نوازی اور ایک جدید تعلیم یافتہ نوجوان کے اکرام کی یہ ایسی مثال ہے کہ طبقۂ علما میں شاذ کے درجے میں اس کا جواب ملے گا

حضرت شیخ الہند کے اس عمل کا ظہور میں آنا تھا کہ دیوبند کے طبقۂ علماء مشائخ میں ایک تہلکہ مچ گیا ان کے نزدیک یہ عمل گویا علما کی عزت خاک میں ملا دینے کے مترادف تھا۔ وہ اس کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ ایک روز حضرت قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی دارالعلوم دیوبند کے بانی اعظم کے شاگرد رشید مولانا محمود حسن مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے بانی اعظم سر سید احمد خان کے ایک شاگرد اور جدید تعلیم یافتہ نوجوان محمد علی کے سر پر اپنی دستارِ مبارک اتار کر باندھ دیں گے! افسوس! یہ حضرات فکر و ہمت کی پستیوں میں تھے۔ وہاں سے وہ حضرتِ شیخ الہند کے فکر کی بلندی، علوِ ہمت، دور بینی اور جوہر شناسی کا اندازہ

ہی نہ کر سکتے تھے۔

اگرچہ حضرت علیہ الرحمہ کے اس عمل کا مولانا عبیداللہ سندھی کے مشورہ و تحریک سے کوئی تعلق[1] نہ تھا۔ مولانا سندھی اس موقع پر موجود بھی نہ تھے، حضرت کے عزم و ارادے کا بھی انھیں علم نہ تھا، لیکن نزلہ بر عضوِ ضعیف کے مصداق، ان لوگوں کا غصہ مولانا سندھی پر اترا۔ ان کے جرائم کی فہرست میں اس ناکردہ گناہ کا اضافہ بھی کر لیا گیا کہ اس نے دارالعلوم کے مقدس علما کی عزت کو علی گڑھ کے بے دینوں اور نیچریوں کے قدموں میں لٹا دیا۔ افسوس کہ انھیں اس وقت شرم نہ آتی تھی جب قاسمی غیرت دینی اور حمیتِ ملی کو گورنر یوپی کے حضور میں سپاس نامہ پیش کر کے اور کتب خانہ دارالعلوم کے خلوت کدے میں خوشامدانہ جذبات پیش کر کے لٹا رہے تھے اور گورنر ان کے چہروں پر ایک نظرِ حقارت ڈال کر مسکرا رہا تھا۔ شرم کی بات یہ تھی، جو دیوبند کی سرزمین پر اور دارالعلوم کے اسلامی اور دینی مرکز میں ہوئی تھی سیکریٹری حکومت یوپی، حکومت ہند کے سیکریٹری کو یہ خوش خبر سناتا ہے۔

- "ہز آنر (گورنر یوپی سر جیمس مسٹن) نے یکم جنوری ۱۹۱۵ء کو کالج (دارالعلوم) کا دورہ کیا اور اس کے باوجود کہ محمد علی اور دہلی کے ایجی ٹیٹر جلسے میں موجود تھے، ہز آنر کا شاندار استقبال کیا گیا۔
- دارالعلوم کے تمام افراد کی موجودگی رسمی (غیر مقدمی اور شکرے کی) تقدیر کا تبادلہ ہوا اور
- اس کے بعد دارالعلوم کے کتب خانے میں خوشگوار ماحول میں دل کھول کر آزادانہ تبادلہ خیال ہوا۔

اس طرح باہم دوستی اور تعلقات قائم ہوئے۔

- کالج کے پرنسپل (مہتمم دارالعلوم مولانا محمد احمد) کو وائسرائے کی جانب سے شمس العلماء کا خطاب دینے اور (ان کی جانب سے) بالکل غیر متوقع طور پر پیش کیے گئے۔ سپاس نامہ سے یہ روابط مزید استوار ہوئے ہیں۔ لیفٹننٹ گورنر کا خیال ہے کہ اس کے نتائج دور رس اور قابل اطمینان ہوں گے"

واضح رہے کہ یہ سر جیمس مسٹن وہی گورنر تھا جس نے کان پور کی مچھلی بازار کی مسجد سے ایک حصے کو پولیس کی سنگینوں کے سائے میں تڑوا کر پھنکوا دیا تھا اور مسلمانوں کی کسی درخواست اور التجا کو درخور اعتنا نہ سمجھا تھا اس

---

[1] اس سلسلے کی حکومت یوپی اور سی آئی ڈی کی خفیہ رپورٹیں اس مضمون کے آخر میں شامل کر دی ہیں۔ تفصیلی مطالعے کے لیے اس سے رجوع کریں۔

کی مسلم دشمنی کی مولانا محمد علی سے اس کی مراسلت گواہ ہے۔ مولانا محمد علی اپنے اخبار ہمدرد اور کامریڈ میں اس پر طنز و تنقید کر چکے تھے اور اس کی مسلم دشمنی پر مقالات لکھ چکے تھے۔ دارالعلوم میں حضرت مولانا قاسم نانوتوی کے صاحبزادے شمس العلماء مولانا محمد احمد اور دیوبند کے نامور عثمانی خاندان کے بطلِ جلیل مولانا حبیب عثمانی (ابن مولانا فضل الرحمٰن عثمانی) اپنے برادرانِ گرامی قدر مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی اور علامہ شبیر احمد عثمانی کے ساتھ دارالعلوم کے کتب خانے کی خلوت گاہ میں مصروف راز و نیاز تھے اور سر جیمس مسٹن کے ذریعے دنیا کے سب سے بڑے استعمار اور قوم و وطن دشمن حکومت سے روابط استوار و مستحکم کر رہے۔ مولانا محمد علی ان خلوتیانِ راز و نیاز میں شامل نہیں تھے، لیکن جلسہ عام میں جب خیر مقدمی تقریر اور رسم شکریہ ادا کی جا رہی تھی تو وہ حیرت زدگی کے ساتھ دیوبند کے قاسمی اور عثمانی خاندان کے صاحب زادگان کی سیرت کی پستی اور اخلاق باختگی کا نظارہ کر رہے تھے اور زبانِ حال سے کہہ رہے تھے کہ خدایا! دیوبند کی سرزمین پر اسلامی و ملی غیرت اور قومی حمیت کی تباہی کا یہ منظر دیکھنا بھی قسمت میں لکھا تھا۔

مولانا محمد علی کی بے لگام زبان سے ہمیں بھی شکایت ہے قومی زندگی میں ان کے فکر کی غلطی اور بعض رویوں سے نقصان بھی پہنچا ہے[۵]، لیکن اس کا قلب صاف، جذبہ صادق اور استعمار دشمنی شک و شبہ سے بالا تھی۔ حضرت شیخ الہند نے مرحوم کی حمیت اور ذوق کے اسی پہلو سے متاثر ہو کر ان کے سر پر اپنا عمامہ رکھ دیا تھا۔ وہ عالم دین نہ تھے۔ دینی حیثیت سے ان کی توقیر نہ کی گئی تھی۔ ان سے ملک و ملت کی خدمت کا کام لینا تھا، جس کے وہ ہر طرح اہل تھے۔

ایک اور مسئلہ :

اس مسئلہ کی تفصیل یہاں حذف کر دی گئی ہے

---

۵ مولانا محمد علی مرحوم کے حق میں ہمارے بزرگوں سے بھی کوتاہیاں ہوئی ہیں۔ جن کی بدولت وہ فرنگی محل کے علماء کے حلقۂ ارادت میں چلے گئے اور علمائے دیوبند کی قومی و ملی تحریک کو ان کی ذات سے کوئی خاص فائدہ نہ پہنچ سکا لیکن نہ صرف حضرت شیخ الہند بلکہ آپ کے بعض نامور تلامذہ مولانا سید حسین احمد، مفتی کفایت اللہ دہلوی، علامہ انور شاہ کاشمیری وغیرہم کے وہ ہمیشہ معتقد رہے اور ان کے بارے میں کبھی ان کی زبان سے کوئی بے جا لفظ نہیں نکلا۔ ہمارے ان بزرگوں نے بھی ان کے اخلاص کا ہمیشہ اعتراف اور اُن کے جذبات کا ہمیشہ احترام کیا

ان اختلافات کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کے اجتماعی مفادات اور قوم و وطن کی آزادی کی ایک عظیم الشان تحریک ختم ہو گئی۔ قومی و ملی جنگ کا ایک اہم محاذ سست و نابود ہو گیا۔ دیوبند کے بہترین دماغوں اور اعلیٰ ذہنی و فکری صلاحیتوں اور انقلاب کے اعضاء و جوارح کو ایسا منتشر کیا گیا کہ پون صدی سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود علم و عمل کی وہ بہترین صلاحیتیں یک جا نہ ہو سکیں اور قوم و وطن اور دین و ملت کو ان اجتماعی صلاحیتوں اور قوتوں سے جو فائدہ پہنچ سکتا تھا وہ نہیں پہنچ سکا۔ بلکہ دیوبند کی اس انقلابی تحریک قاسمی، عثمانی اور فاروقی (نانوتوی) خاندانوں کے کٹ جانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسی لیچرپن اور بے دینی کو فروغ حاصل ہوا جس کے الزام میں مولانا سندھی کو دیوبند سے نکالا گیا تھا۔ اور جن بزرگوں نے حضرت شیخ الہند کی انقلابی سیاست و قیادت سے انکار کیا تھا انھوں نے اور اُن کی ذریت نے آغا خانی و اسماعیلی شخصیات کو اپنے سروں پر بٹھایا اور اُن کے مقاصد کو نہ صرف فائدہ پہنچایا بلکہ ان کے لیے قانونی و شرعی جواز پیدا کیا اور انھیں اتنا مضبوط و مستحکم کر دیا کہ اب اگر ملک کی ساری اسلامی انقلابی قوتیں بھی مل کر ان کا تدارک کرنا چاہیں تو ممکن نظر نہیں آتا۔ اگرچہ حضرت شیخ الہند کی قیادت سے انکار بہ ظاہر ایک سیاسی اختلاف تھا، لیکن چونکہ اس کی بنیاد بعض اشخاص اور خاندانوں کے ذاتی، محدود اور سطحی مفادات پر تھی، اس لیے نہ صرف ملی اجتماعی تحریک کو نقصان پہنچا بلکہ دیوبند کے دینی مکتبہ فکر میں بھی اختلاف کی ایک ایسی خلیج پیدا کر دی ہے جس کے وجود سے انکار ممکن نہیں اس سے دیوبند کے دشمنوں اور مخالفوں نے ہمیشہ فائدہ اٹھایا ہے، اور نقصان خود ان کے حصے میں آیا۔

مولانا سندھی کی تکفیر اور دیوبند سے اخراج کے اصل وجوہ:

یہ سوال اب تشنۂ بحث ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی کے دیوبند سے اخراج کے اصل وجوہ کیا تھے؟

۱۔ جہاں تک مسئلہ تبلیغ کا تعلق ہے، معلوم ہو چکا ہے کہ یہ مسئلہ اتنا بڑا نہ تھا کہ دارالعلوم کے ایک نامور اور ذہین و باصلاحیت فرزند کو اس کی مادرِ علمی سے جدا کر دیا جاتا بلکہ اس پر کفر کا فتویٰ بھی لگا دیا جاتا۔ جب کہ حضرت شیخ الہند کی رائے بھی وہی تھی۔ حضرت شیخ الہند نے اس مسئلے پر جن خیالات کا اظہار فرمایا تھا، اس سے کسی کو اختلاف نہ تھا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے اسے اس باب میں حرفِ آخر قرار دیا ہے۔ اور مولانا انور شاہ کاشمیری نے مولانا سندھی کے خیالات پر جو رویہ اختیار کیا تھا، اسے اپنی غلط فہمی تسلیم کر کے معذرت خواہ ہو گئے تھے۔

۲۔ ہندو مسلم اتحاد کی تحریک میں مصالح ملی کی بنا پر اس کے کسی پہلو سے، طریقہ کار سے، دائرہ اتحاد سے یا

اندازِ فکر میں کسی خامی کی بنا پر اختلاف تو کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس بنا پر دیوبند سے مولانا سندھی کے اخراج اور تضلیل و تکفیر کے فتوے کا کوئی جواز نہ تھا۔

۳۔ جدید تعلیم یافتہ حضرات سے ربط و ضبط کا مسئلہ بھی اتنا اہم نہ تھا کہ مولانا سندھی کو دیوبند سے نکالا جاتا اور ان کے اس عمل و اعتقاد کو ضلالت و کفر قرار دیا جاتا۔ جب کہ اس مکتبۂ فکر کے لوگ جدید تعلیم یافتہ حضرات کے رجوع کو اپنی بزرگی اور مرجعیت کی دلیل سمجھتے ہیں۔ اب تو اُن کے الحاد و نیچریت کے افسانے کی افسوں گری کا دور ہی ختم ہو گیا ہے۔ اب دین سے بیگانے کسی مسئلے میں جدید تعلیم یافتہ حضرات کو گم کردہ راہ تو کہا جا سکتا ہے۔ انھیں کافر نہیں کہا جا سکتا۔ پھر اس شخص کے کفر کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جو ان کے باب میں وقت کے کسی سیاسی، سماجی یا اجتماعی مسئلے میں اختلاف رکھتا ہو۔

۴۔ حضرت شیخ الہند کا مولانا محمد علی کے سر پر اپنی دستار رکھنا خواہ کتنا ہی نامناسب اور بے محل مان لیا جائے اور خواہ یہ عمل دیوبند کی عزت کو خاک میں ملا دینے کے مترادف ہی کیوں نہ قرار دے لیا جائے اور خواہ اس عمل کا موجب مولانا سندھی ہی کو کیوں نہ مان لیا لیکن اس بنا پر انھیں کفر کا مستوجب ٹھیرانا تو ہرگز معقول قرار نہیں دیا سکتا اور نہ دیوبند سے ان کے اخراج کے لیے یہ وجہ کافی ہو سکتی ہے۔

ان میں سب سے بڑا مسئلہ تبلیغ کا تھا۔ لیکن اس کی کوئی حیثیت ایسی نہ تھی جس کی بنا پر کفر تو درکنار فسق و ضلالت کا الزام بھی لگایا جائے۔ دوسرے تمام مسائل کا تعلق اجتماعی اور سیاسی و سماجی زندگی سے تھا ان کا ترک و اختیار مصالح ہی پر مبنی تھا۔ اسلامی اعتقادات سے ان کا تعلق کوئی نہ تھا۔ ان کے اختیار کی اتنی اہمیت نہ تھی کہ مولانا سندھی کے کفر و ایمان کا فیصلہ کر دیا جاتا تھا۔ پھر یہ کہ وہ تمام اعمال حضرت شیخ الہند کے ایما و مشورہ سے انجام دیے جا رہے تھے اس لیے ان کے اصل ذمہ دار حضرت شیخ الہند تھے۔ نہ کہ مولانا سندھی! مفتی عزیز الرحمٰن نے اسی طرف اشارہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"لیکن سوال یہ ہے کہ اگر یہ سب کچھ علمی اختلافات تھے، تو کیا یہ اختلافات اس قابل تھے کہ ایک سرگرم کارکن کو ضائع کر دیا جائے؟ اور کیا پھر یہ حالات صرف علامہ سندھی ہی کے پیدا کیے ہوئے تھے؟ اگر غور کیا جائے تو اصل تحریک کے محرک اعلیٰ حضرت شیخ الہند تھے لیکن حضرت شیخ الہند سے کون ٹکر لیتا؟"

(تذکرہ شیخ الہند، بجنور، ۱۹۶۵ء، ص ۷۶، ۱۷۵)

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ مولانا سندھی سے اختلاف، ان کی تضلیل، تکفیر اور دیوبند سے ان کے اخراج کی وجہ دوسری تھی۔ اس سلسلے میں اب کسی مزید بحث کی ضرورت نہیں صرف ان بیانات کو نقل کردینے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ جو براہ راست معلومات، تحقیقات، سی آئی ڈی یا گورنمنٹ کی خفیہ رپورٹوں پر مبنی ہیں۔

۱۔ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں آیا ہے:

"عبیداللہ سکھ سے مسلمان ہوا ہے اور صوبہ جات متحدہ کے ضلع سہارن پور میں مسلمانوں کے مذہبی مدرسہ (دارالعلوم) دیوبند میں اس نے مذہبی تعلیم پائی۔ وہاں اس نے اپنے جنگی (انقلابی) اور خلاف برطانیہ خیالات سے عملۂ مدرسہ کے خاص لوگوں اور کچھ طلبہ کو متاثر کیا اور جس نے اس پر اثر ڈالا، وہ محمود حسن تھا جو اس مدرسہ میں بہت عرصہ تک ہیڈ مولوی (صدر مدرس) رہ چکا ہے۔ عبیداللہ چاہتا تھا کہ دیوبند کے مشہور مدرسہ کے تعلیم یافتہ مولویوں کی رفاقت سے ہندوستان بھر میں ایک عام اسلامی جوش اور مسلمانوں میں برطانیہ کے خلاف تحریک پھیلائے لیکن اس کی تجاویز کے راستے میں مدرسے کے مہتمم اور انجمن کے لوگ رکاوٹ بن گئے انھوں نے اُسے اور اُس کے چند ساتھیوں کو مدرسہ کی ملازمت سے برخاست کردیا۔"

(علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے حصہ اول از مولانا سید محمد میاں مطبوعہ مراد آباد ۱۹۴۶ء ص ۱۶۵)

اس میں مولانا سندھی مرحوم کا جرم انقلابی اور خلاف برطانیہ خیالات کا پھیلانا، بعض لوگوں اور طلبہ کو متاثر کرنا پھر مدرسہ کے تعلیم یافتہ مولویوں (یعنی جمعیت الانصار) کی رفاقت سے ہندوستان بھر میں عام انقلابی اور مسلمانوں میں خلاف برطانیہ تحریک پھیلا دینا بیان کیا گیا ہے اور مدرسہ (دارالعلوم) کے مہتمم اور انجمن (جمعیت الانصار) کے بعض لوگ (مولانا شبیر احمد عثمانی) وغیرہم کا کارنامہ اس تحریک میں "رکاوٹ بن جانا" ہے مولانا سندھی کو ملازمت سے برخاست کردینا بیان ہوا ہے۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ مولانا سندھی مدرسہ کے ملازم نہیں تھے جمعیت الانصار کے کاموں کی انجام دہی کے سلسلے میں انھیں وظیفہ ملتا تھا۔ جو ان کی نظامت کے استعفے کے بعد بند ہو گیا تھا۔ یہاں اسی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ نقش حیات از: مولانا سید حسین احمد مدنی، کراچی

نقش حیات حضرت مدنی علیہ الرحمہ کی خود نوشت ہے۔ ۱۹۵۳ء میں ہندوستان سے چھپی تھی۔

میرے پیش نظر کراچی کی اشاعت ہے۔ اس میں کئی جگہ پر اس مسئلے کے بارے میں بعض اشارات ہیں۔ ایک جگہ پر حضرت فرماتے ہیں:

الف، "انھوں (ارباب اہتمام دارالعلوم) نے مولانا عبیداللہ سندھی کی [illegible] کو نہ صرف دارالعلوم دیوبند بلکہ عام مسلمانوں کے لیے بھی خطرناک تصور کیا اور اپنے خیالات کے مطابق ضروری سمجھا کہ مولانا سندھی کا تعلق اس مرکز سے نہ رہے۔ اسی زمانے میں اتفاق سے چند علمی مسئلوں میں مولانا سندھی اور دارالعلوم کے دوسرے علماء کے درمیان "اختلاف پیدا کرا دیا گیا"۔ اسی اختلاف کو وجہ قرار دے کر مولانا سندھی کو دارالعلوم سے علیحدہ کر دیا گیا چنانچہ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں اس طرف اشارہ موجود ہے۔"

اس اختلاف نے اگرچہ دارالعلوم کے اساتذہ، ملازمین اور عام طلبہ کو حضرت مولانا سندھی سے بہت زیادہ بعید کر دیا تھا، لیکن حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز سے تعلق میں کوئی فرق نہیں آیا خفیہ آمد و رفت جاری رہی۔ رات کے اندھیروں میں دیوبند کے باہر ملاقاتیں ہوتی تھیں [illegible] باتیں انجام پاتی تھیں۔"

حضرت شیخ الاسلام کے اس بیان میں یہ جملہ خاص توجہ کا مستحق ہے کہ "اختلاف پیدا کرا دیا گیا" اس کی وجہ وہی سندھی کی انقلابی اور استعمار دشمن سرگرمیاں تھیں۔

ب دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

"بہر حال اصل سبب وہ امر ہے جس کی بنا پر مسٹن گورنر یوپی، دیوبند آیا تھا اور دارالعلوم میں گیا مہتمم صاحب کو شمس العلماء کا خطاب ملا تھا۔"

اس بیان کو بنیاد بنا کر مولانا سید اسعد مدنی نے لکھا ہے کہ اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ دارالعلوم سے مولانا سندھی کی علیحدگی خود برطانوی گورنمنٹ کے اشارے پر عمل میں آئی تھی۔"

(ایک خود ساختہ داستان حقائق کے آئینے میں، ص ۷)

۳۔ تذکرہ شیخ الہند از مفتی عزیز الرحمٰن (بجنوری)، بجنور ۱۹۶۵ء

تذکرہ شیخ الہند ایک اہم تصنیف ہے اور مفتی صاحب نے اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کی ہے:

الف: جمعیت الانصار کی یہ تنظیم اگرچہ بالکل مذہبی تحریک تھی لیکن حضرت شیخ الہند ملک میں

ایک صالح اور قابل معاشرہ تیار کر رہے تھے اور اس کو منظم کر رہے تھے۔ اس لیے کہ آئندہ چل کر ہندوستان کے باہر سے انقلاب لایا جائے تو اندرون ملک ایک منظم گروہ ہونا چاہیئے جو انقلاب کو کامیاب بنائے، ایک اشارے پر رات کی رات میں امریکہ کی طرح حکومت کا ڈھانچا بدل دے۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ ملک اندر بہ کثرت لائق اور صالح اپنے افراد موجود ہوں لیکن افسوس کہ اپنی حکومت کے قیام کا یہ منصوبہ کامیاب نہ ہوسکا۔ کیونکہ تحریک کے ساتھ حکومت کی بدظنی اور اپنوں کی خوشامدانہ پالیسی اور ریشہ دوانیوں میں بھی اضافہ ہوتا رہا" (ص ۱۴۳)

ب : ارباب اہتمام دارالعلوم دیوبند مولانا سندھی کی ان سرگرمیوں کو اپنے اور دارالعلوم دیوبند کے لیے خطرے کی گھنٹی سمجھتے تھے اور اس خطرے کو مول لینے کے لیے ارباب اہتمام کسی طرح تیار نہ تھے اس لیے انھوں نے علامہ سندھی کی خلاف چند مسائل کھڑے کیے تاکہ ان کو دارالعلوم سے یہ کہہ کر نکال دیا جائے کہ وہ اکابر کے مسلک سے ہٹ گئے ہیں۔ یا گمراہ ہو گئے ہیں یا ان کے افکار و نظریات گمراہ کن ہیں لہذا ایسے شخص کا دارالعلوم کی چہار دیواری میں رکھنا طلبہ کے لیے مضر ہے" (ص ۱۷۴)

ج : چناں چہ ارباب اہتمام نے چند مسائل کھڑے کیے اور مولانا کشمیری (انور شاہ) اور علامہ عثمانی (شبیر احمد) کی ٹکر علامہ سندھی سے کرادی اور دیوبند میں ان ہر سہ حضرات کے درمیان مناظرہ ہوا، جو حقیقت میں مولانا سندھی کے نکالنے کے لیے ایک بہانہ تھا چناں چہ علامہ سندھی کے خلاف ایک ہلڑ بازی کھڑی کردی گئی اور ان کی پوزیشن کو ملک میں مجروح کرنے کی کوشش کی گئی" (ص ۱۷۴)

د : جمعیت الانصار کے پروگرام اور اس کی بنا دیرے سے جہاں انگریزوں کو بوکھلاہٹ تھی، وہاں دارالعلوم دیوبند کے ارباب اہتمام کے اقتدار پر بھی شدید ضرب واقع ہو رہی تھی، جس کے لیے انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ علامہ سندھی پر علمی اور مذہبی الزامات لگا کر ان کو علیحدہ کر دیا جائے" (ص ۱۷۶)

ان چند اقتباسات میں مولانا سندھی مرحوم کے جرم، دیوبند سے ان کے اخراج کے حقیقی و واقعی پس منظر اور ارباب اہتمام دارالعلوم کے کارنامے کے تمام پہلو مختصر طور پر مرتب ہو گئے ہیں۔

۴. تحریک شیخ الہند، از مولانا سید محمد میاں، دہلی ۱۹۷۵ء

تحریک شیخ الہند مولانا محمود الحسن، دراصل ریشمی خطوط سازش کیس کے وہ ڈاکومنٹس ہیں جو انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہیں۔ انھیں حاصل کرکے اور مرتب کرکے [illegible] تفصیل کے ساتھ جمعیت الانصار اس کے مقاصد، مولانا عبیداللہ سندھی [illegible] حضرت شیخ [illegible] کا تذکرہ آیا ہے۔ درحقیقت یہ

پوری کتاب اور اس کی تمام دستاویزات حضرت شیخ الہند اور مولانا سندھی کی سیاسی انقلابی تحریک کی تفصیلات پر مشتمل ہے :

الف) اس میں جمعیت الانصار کے نظام و مقاصد کے بارے میں لکھا ہے ۔

" جمعیۃ الانصار ، دیوبند ، مولوی عبیداللہ سندھی کی نظامت اور چھ سات ممبروں پر مشتمل مجلس منتظمہ کے ساتھ ۱۹۱۱ء میں قائم ہوئی یہ انجمن مدرسہ دیوبند میں تعلیم پائے ہوئے مولویوں (علمائے قدیم) کی انجمن کے طور پر قائم کی گئی تھی ، اس کا مقصد یہ تھا :

الف : مدرسہ دیوبند کا انتظام کرے اور اس کو بہتر بنائے ۔

ب : مدرسہ کے لیے رقم کا انتظام کرے

ج : دیوبند میں جن عقائد کی تعلیم دی جاتی ہے ، ان کی تبلیغ کرے اور انھیں فروغ دے اور

د : دوسرے مقامات پر ایسے ہی مدرسے قائم کرے ۔

تجویز یہ تھی کہ تمام مدارس اسلامیہ کو جمعیۃ الانصار کے تحت کر دیا جائے اور دیوبند سے فارغ التحصیل مولویوں کو ان مدارس میں مدرس مقرر کیا جائے ۔

اس کے قواعد و ضوابط باضابطہ تیار کیے گئے تھے اور اس کے سالانہ جلسے مراد آباد اور میرٹھ میں ہوئے تاکہ جمعیۃ الانصار کے مقاصد کی تبلیغ کی جا سکے ۔

لاہور کے صوفی مسجد کے مولوی ابو احمد نے نائب ناظم کی حیثیت سے ۱۹۱۱ء میں چند ماہ کام کیا ۔ ص ۳۳-۲۳۲

ب : جمعیت الانصار میں اختلاف ، اس کے وجوہ اور مولانا سندھی کے دیوبند سے اخراج کے بارے میں اس میں یہ دفعات ہیں :

- " ابتدا میں دیوبند کے مدرسے کی ساری مجلس منتظمہ جمعیت الانصار کے حق میں تھی
- جلد ہی (مولوی) عبیداللہ نے انگریزی پڑھے ہوئے نوجوانوں کو طالب علم کی حیثیت سے لینا شروع کر دیا اور اس سے جمعیت نے نیم سیاسی نوعیت اختیار کر لی ۔
- جب جنگ بلقان ہوئی اور دیوبند کے ذمہ داروں نے ترکی کی مالی امداد کے جواز کا فتویٰ دیا تو اچانک جمعیت الانصار اپنے اصلی رنگ میں آ گئی اور انتہائی متعصب جماعت بن گئی ۔
- مولوی طلبہ اور دوسرے لوگ مبلغ بنا کر بھیجے جانے لگے اور ترکی کی مدد کے لیے ہلال احمر کے فنڈ

میں بڑی بڑی رقمیں جمع کی جانے لگیں۔

٥ غیر ملکی سامان کے بائی کاٹ کی تبلیغ بڑے شد ومد سے کی گئی۔

٥ اس کی شاخ قاسم المعارف نے کلکتہ میں چندہ جمع کرنے کے سلسلے میں بہت زیادہ سرگرمی دکھائی۔

٥ اس پر مدرسہ کے عملے کے کچھ سنجیدہ لوگ چوکنے ہوئے اور ایسے اختلافات پیدا ہوئے کہ عبید اللہ کو ۱۹۱۳ء میں استعفا دینا پڑا۔

٥ جلد ہی اس انجمن کا وجود ختم ہو گیا۔" (ص ۲۳۲)

ج ایک دوسرے مقام پر ہے کہ:

٥ "مدرسے کی نیک نامی کی بقا کے لیے مجلس منتظمہ نے فیصلہ کیا کہ عبید اللہ، انیس احمد اور دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ مدرسہ سے خارج کر دینا چاہیئے۔

٥ مولانا (محمود حسن) نے یہ فیصلہ پسند نہیں کیا۔"

۵۔ ایک خود ساختہ داستان حقائق کے آئینے میں - از مولانا سید اسعد مدنی، دیوبند ۱۴۰۱ھ

مولانا قاری محمد طیب مرحوم نے مولانا اسعد مدنی کی ایک تقریر کے بعض مطالب سے اختلاف کرتے ہوئے ایک ہشت ورقی کتابچہ "ایک خود ساختہ داستان کی حقیقت" شائع فرمایا تھا اس میں انھوں نے مولانا سندھی مرحوم کے دارالعلوم سے اخراج کے معاملے میں اپنے والد مرحوم "شمس العلما مولانا محمد احمد" کا نہ صرف دفاع کیا بلکہ جنگ آزادی میں ان کی رہنمائی کا ذکر بھی کیا ہے اس کے جواب میں مولانا سید اسعد مدنی نے مولانا سندھی کے دیوبند سے اخراج کے معاملے پر بحث کی اور حقائق کی روشنی میں حضرت قاری صاحب مرحوم کے مغالطات کو رفع فرمایا اس کتابچے کے متعدد اقتباسات اس مضمون میں نقل ہو چکے ہیں۔ اس لیے تکرار کی ضرورت نہیں صرف ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

مولانا سید اسعد مدنی لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ الاسلام (مولانا سید حسین احمد مدنی) مولانا مناظر احسن گیلانی اور برٹش حکومت کی سی آئی ڈی اس بات پر متفق ہیں کہ

"مولانا عبید اللہ سندھی کا دارالعلوم سے اخراج اور جمعیۃ الانصار کی شکست و ریخت محض اس بنیاد پر تھی کہ مولانا سندھی نے ارباب اہتمام کے علی الرغم اس کا رخ انگریز گورنمنٹ کی مخالفت کی جانب موڑ دیا تھا اور حقیقتاً حضرت شیخ الہند کے سامنے جمعیۃ الانصار کے قیام کا مقصد بھی یہی تھا۔" (ص ۹)